قضیہ فلسطین اور موروثیت

فلسطین جسےتاریخی طورپر شام کہا جاتا تھا انسانی تہذیبوں میں اپنی سیاسی، معاشی، مذہبی اور ثقافتی وجوہات کی بناء پر صیہونی غیر قانونی تسلط سےقبل بھی اپنا الگ مقام رکھتا تھا اور اسےیہودی اور عیسائی روایات میں بھی تقدس حاصل تھا۔ قرآن کریم نےاسی علاقےکےحوالےسےسورہ بنی اسرائیل یا اسراء کےآغاز میںیوں ارشاد کیا ہے ’’پاک ہےوہ جو لےگیا ایک رات اپنےبندےکو مسجد حرام سےدور کی اس مسجد تک جس کےماحول کو اس نےبرکت دی ہےتاکہ وہ اسےاپنی کچھ نشانیوںکا مشاہدہ کرائے‘‘ (۷۱:۱)۔ تفصیلات میںجائےبغیر اس آیت مبارکہ میںپہلی بات یہ واضح کر دی گئی ہےکہ الصخرہ کےاردگرد کا ماحول خصوصیت رکھتا ہےاور اسےاللہ تعالیٰ نےبرکت سےنوازا ہے۔ یہی سبب ہےکہ الاقصیٰ یا دُور والی مسجد کو القدس نہ صرف عربی بلکہ عبرانی زبان میںبھی کہا گیا ہے۔
دوسری بات یہ سمجھائی گئی ہےکہ اس میں اہل ِ دانش کےلیےنشانیاں ہیں یعنی قوموں کےعروج و زوال کی داستان کےبعض اہم ابواب کا تعلق اس خطہ کےساتھ ہے۔ یہاں قرآن کریم نےیہودی اساتیر کےاس نقطہ نظر سےمکمل طورپر اختلاف کیا ہےجس میں یہودیوں کے’’منتخب قوم‘‘ ہونےکی بناء پر گویا انہیں القدس وراثت میں اس طرح دے دیا گیا ہےکہ اس کی تولیت نسلاً بعد نسل صرف یہودی تخم رکھنےوالی نسل ہی میں رہے۔ قرآن کریم زمین اور حیات بعد الممات میںانسانوں کو شرف دینےکا سبب نہ ان کی نسلی، لسانی، قبائلی یا خطےسےوابستہ عصبیت کو قرار دیتا ہےاور نہ ایسی کسی وراثت کا قائل ہےجو ازل تا ابد کسی ایک گروہ کےسپرد کر دی جائے۔
قرآنی اخلاقیات میں ان تعصبات کی جگہ تقویٰ، بندگی ٔ رب اور حاکمیت الہٰی کےقیام کو معیار قراردیا گیا ہے۔ چنانچہ جب تک ایک گروہ انسانیت اس اخلاقی ضابطےپر عمل کرتا ہےزمین پر اختیار کا مستحق قرار پاتا ہےوگرنہ اس سےبہتر گروہ کےذریعہ ایک تاریخی عمل کےطورپر تبدیلی لائی جاتی ہے۔ ’’یہ تو زمانےکےنشیب و فراز ہیںجنہیںہم لوگوں کےدرمیان گردش دیتےرہتےہیں‘‘(آل عمران۳: ۰۴۱)۔ قوموں کےعروج وزوال کےقرآنی نظام میں للہٰیت او رعدل کو بنیاد قرار دےکر یہ بات سمجھائی گئی ہےکہ جو قوم بھی اپنا تعلق رب سےجوڑنےکی بجائےجاہلانہ عصبیت و عربیت یا صیہونیت سےجوڑےگی اور بندگی ٔ رب کو نظرانداز کرتےہوئےجادۂ عدل سےانحراف کرےگی وہ قیادت کی مستحق نہیںہو سکتی۔
لیکن کیا اس کا مطلب یہ لیا جائےکہ اگر حقیقت واقعہ کےطور پر ایک سفاک طاغوتی قوت کسی خطہ پر قابض ہےاور اس کےافراد کو محکوم ،مظلوم اور مستضعفین بنا کر ظلم کا نشانہ بنا رہی ہےتو اسےیہ اختیار دےدیا جائےاور یہ سمجھا جائےکہ طاغوت کےمسلط ہونےمیںحمایت ربانی شامل ہے؟بات بہت واضح ہےکہ جو عدل،رحم وکرم،اور شفقت کا منبع ہےجو اپنےبندوںسےہر لمحہ محبت کرتا ہےوہ طاغوت اور ظلم کی نہ تو پشت پناہی کر سکتا ہےنہ اسےظلم کرتےہوئےدیکھ کر خوش ہو سکتا ہے۔
یہی وجہ ہےکہ قرآن کریم نےایسےمجبور وبےکس افراد کےحوالےسےیوںہدایت کی ہے’’آخر کیا وجہ ہےکہ تم اللہ کی راہ میںان بےبس مردوں،عورتوںاور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیےگئےہیںاور فریاد کر رہےہیںکہ ہمارےرب ہم کو اس بستی سےنکال جس کےباشندےظالم ہیں،اور اپنی طرف سےہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے‘‘(النساء ۴:۵۷)۔ گویا ظلم جہاںبھی ہو اورجس کسی کو اس کےاپنےگھر میںمجبور و بےکس بنادیا گیا ہو قرآنی اخلاقیات کا مطالبہ ہےکہ اسےطاغوت سےنجات دلانےمیںمدد کی جائےاور حقوق انسانی کی بحالی کےلیےجہاد کو اختیار کیا جائے۔
اس تناظر میںدیکھا جائےتو صیہونی قابضوںکا یہ دعویٰ کہ ان کا فلسطین پر کوئی آبائی حق ہے،نہ قرآن کی روشنی میںاور نہ خود ان کےمصادر کی بنیاد پر کوئی سنجیدہ دعویٰ خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالےسےریچل میسی نائےکا مقالہ Historiography in Relations to the Territory of Palestin ذہنیت لادینی وقت بیک ہےاور کرتا فراہم معلومات قیمتی

3 / 1

رکھنے والے مفکرین اور دیگر حضرات کے تصورات کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔ اس نوعیت کی علمی بحث سے قطع نظر فلسطین کے مسلم اور عیسائی باشندوں پر صیہونی مظالم بیسویں صدی کی تاریخ کے تاریک ترین باب سے تعلق رکھتے ہیں اور صرف سماعت، بینائی، اور قوتِ عقل سے محروم شخص ہی فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کا انکار کر سکتا ہے۔

اس پورے قضیے میں مغربی طاقتوں کا گھناؤنا کردار بھی ایک شفاف تاریخی حقیقت ہے۔ برطانیہ ہو یا امریکہ ناموں کے فرق کے باوجود دونوں قوتوں نے اپنے مقدور بھر ظلم کا ساتھ دینے اور مظلوم فلسطینیوں کو عدل سے محروم رکھنے میں ایک سفاکانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فلسطینیوں پر اس ظلم کے ذمہ دار صرف بیرونی دوست نما دشمن ہیں بلکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ خود فلسطینیوں کے بعض دھڑے اور نام نہاد عرب قومیت کے علمبردار ممالک نے زبانی جمع خرچ کے سوا آج تک کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جو ان کی سنجیدگی کا پتہ دیتا ہو۔ اگر پوری صورت حال کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے تو تین عوامل بہت نمایاں طور پر کارفرما نظر آتے ہیں۔ اولاً مغرب کے علمی اور ابلاغی حلقوں کی طرف سے ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے طور پر عالمی افق پر معلومات کا اس طرح نشر کرنا کہ فلسطینی ظالم، قاتل، دہشت گرد، خودکش حملہ آور اور بنیاد پرست اور سیامیت کش (semlt-anti) نظر آئیں اور ارض مقدس پر ناجائز قبضہ کرنے والے، نسل پرست، خون آلود ہاتھوں والے اسرائیلی اس ظلم کا نشانہ سمجھے جائیں۔ معروف ماہر لسانیات ایڈورڈ سعید کی تصنیفات اس حوالہ سے انتہائی مستند حقائق فراہم کرتی ہیں۔

ثانیاً خود فلسطینیوں کو اس ابلاغی سازش کے نتیجہ میں نفسیاتی اور ذہنی طور پر دو بیماریوں میں مبتلا کر دیا جائے یعنی اوّل یہ کہ وہ ایک کمزور، بےبس، پسماندہ لوگ ہیں جنہیں اگر کوئی خیرات دے دی جائے تو انہیں شکرگزار ہونا چاہیے گو وہ اس خیرات کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ صیہونیوں کی شرائط پر جن کی حمایت برطانیہ اور امریکہ روز اول سے کرتا رہا ہے احسان مندی کے ساتھ عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو اور روٹی کے جو بھی ٹکڑے انُہیں دے دیے جائیں، اس پر شا کر شاداں ہونے

کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔ دوم یہ کہ یہ تصور نہ صرف فلسطین کے مظلوم باشندوں بلکہ نام نہاد عرب قومیت کے علمبردار ممالک کے فرمانرواؤں کے بھی ذہن نشین کرا دیا جائے کہ مسئلہ کا حل صرف گفتگو سے ہی ہو سکتا ہے۔ قوت کا استعمال کوئی کام نہیں کر ے گا۔ یہ نصیحت اور تصور ان اقوام کی طرف سے گزشتہ ۶ سال سے پیش کیا جا رہا ہے جو موجودہ دور کی تاریخ میں سب سے زیادہ قوت کے اندھے استعمال پر عمل کر کے کروڑوں افراد کے سفاکانہ قتل کی ذمہ دار ہیں۔ اور صرف یہ جانتی ہیں کہ لاٹھی کے بغیر بھینس پر قبضہ نہیں ہو سکتا۔

بہر صورت اس بات میں لازماً صداقت پائی جاتی ہے کہ بعض قضیے گفتگو سے بھی طے ہو سکتے ہیں یہ اسی وقت ہو گا جب دوسرے فریق کو قرآن کریم کی الہامی حکمت کی روشنی میں، یہ احساس ہو جائے کہ اس کا مقابلہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے ساتھ ہے، ایک ایسی قوم کے ساتھ ہے جس کی نگاہ میں موت کا خوف کوئی مقام نہیں رکھتا اور جو شہادت اور جہاد کو اپنا مقصد حیات سمجھتی ہے۔

اس کے برعکس اگر فریق مخالف کو یہ معلوم ہو کہ نام نہاد مسلم فرمانروا ہر اس بات کو لپک لپک کر خوش آمدید کہنے کے لیے بےتاب ہیں جو امریکہ کی طرف سے بطور ایک اشارہ کے بھی آجائے تو مذا کرات اپنا مفہوم کھو بیٹھتے ہیں۔ گویا کمزوری، لاچاری، بےبسی اور افلاس کے احساس کو روح اور دماغ میں اتنا جاگزیں کر دیا جائے کہ اسرائیلی وکیل جو کچھ کہے اسے فوراً شکرگذاری کے احساس کے ساتھ مان لیا جائے۔ یہ ایک مسلسل نفسیاتی جنگ ہے جو ۶ سال سے لڑی جا رہی ہے اور جس کے نتیجہ میں بعض نام نہاد قائدین آخرکار امریکہ کی ہر تجویز کو ماننے پر آمادہ ہوتے چلے گئے ہیں۔

ثالثاً اس مغربی اور صیہونی حکمت عملی کا ایک اہم جزو آبادی کے اس تناسب کو جو ۴ء سے ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت رکھتا تھا اور جس میں مسلمان اور عیسائی فلسطینی اکثریت میں اور صیہونی اقلیت میں تھے اس طرح تبدیل کیا جائے کہ اگر فلسطینیوں کو کچھ ٹوٹے پھوٹے حقوق بطور خیرات دینے بھی پڑیں تو وہ ظالم اور قابض صیہونیوں کے لیے کبھی خطرہ نہ بن سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا نظام بھی عجب ہے اس پورے عرصہ میں صیہونیوں نے چھانٹ چھانٹ کر فلسطینی نوجوانوں کو تشدد اور قتل کا نشانہ بنایا ہے لیکن فلسطین میں آبادی میں نہ صرف نمایاں اضافہ ہوا بلکہ لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کی پیدائش کی شرح زیادہ رہی۔ گویا جہاد کے لیے انسانی وسائل کی فراہمی میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے مغرب نے جو حکمت عملی نہ

صرف ارض مقدس میں بلکہ پورے عالم اسلام میں مسلم دانش وروں کے تعاون سے اختیار کی ہے وہ آبادی پر قابو پاتے ہوئے ترقی کی شرح کو کم سے کم رکھنے کی پالیسی ہے۔ مقام حیرت ہے کہ ایران جیسے ملک نے بھی اپنی شرح پیدائش کو قابو میں کرنے کی اعلیٰ مثال پیش کی ہے اور کل تک جہاں شرح پیدائش ۵ فیصد ہوا کرتی تھی اب ہ فیصد پر ہ گئی ہے۔
مغربی تصور ترقی کا ایک لازمی جزو آبادی پر قابو کا فلسفہ ہے جس کے نتیجے میں یورپ امریکہ اور چین معمر افراد کی کثرت اور نوجوانوں کی قلت کا شکار ہو رہے ہیں۔ لیکن بجائے اس مسئلہ کے فطری حل کی طرف جانے کے مغرب کی حکمت عملی یہ ہے کہ آبادی کے فطری دباؤ کو جو زیادہ آبادی کے خطوں سے کم آبادی کے خطوں کی طرف ہو رہا ہے روکنے کے لیے بجائے اپنے گھر کو درست کرنے کے زیادہ آبادی کی شرح والے ممالک کو اپنی پیدائش میں کمی پر امداد کی رقوم دے کر آمادہ کیا جائے تاکہ آبادی کا بہاؤ ان کی طرف نہ ہو اور اس طرح وہ اپنے اقتدار کو زیادہ محفوظ ہ مستحکم کر سکیں۔
اگر آبادی کے حوالے سے یہ سازش کامیاب ہوتی ہے تو آئندہ ہہ سالوں میں مسلم فلسطین کی جگہ جزوی اکثریت والا خطہ وجود میں آجائے گا اور فلسطینی جو اقلیت نہ ہونے کے باوجود ظلم اور عصبیت کا شکار ہیں ایک اقلیت بن جانے کے بعد اپنے حقوق کی طرف تصور میں بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہیں گے۔
مسلم دانش وروں کا فرض ہے کہ وہ عالمی طاقتوں کی حکمت عملی اور منصوبہ بندی سے شعوری آگاہی کے ساتھ خود اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے متبادل حکمت عملی تجویز کریں اور مسلم دنیا کے مغرب زدہ فرمان رواؤں کو بار بار مستقبل کے خطرات اور مسائل سے متعارف کراتے ہوئے ان مسائل کے حل با الخصوص اپنی سیاسی حاکمیت کو مضبوط کرنے، مغرب کی ذہنی، مادی اور روحانی غلامی سے نجات حاصل کرنے اور دفاع اور معیشت میں بھی خود انحصاری کے حصول کی طرف متوجہ کریں۔
ایک طاقتور مسلم دنیا ہی مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کر سکتی ہے۔ جب تک مسلم دنیا کا سہ گدائی ہاتھ میں لیے اپنے دفاع، اپنی سیاسی آزادی، اپنے تعلیمی نظام، اپنے قانون حتیٰ کہ اپنی زبان ہ ثقافت کے لیے بھی مغربی سامراج کی مرہون منت ہو گی دستوری طور پر آزاد ہونے کے باوجود ایسے ممالک اپنے مفادات کا تحفظ نہیں کر سکیں گے۔
فلسطین کی آزادی اور وہاں پر اسلامی معاشرے کے ساتھ اسلامی سیاسی حاکمیت کا قیام نہ صرف فلسطینیوں کے دل ہ دماغ کا مطالبہ ہے بلکہ ایک عالمی انسانی ضرورت ہے۔ اگر امن عالم ایک ضرورت ہے تو اس کا وجود اسی وقت ہو گا جب فلسطین، کشمیر، میانمر اور دیگر مقامات کی تحریکات حریت کو تقویت پہنچاکر کامیاب کیا جائے تاکہ وہ نزاعات، ظلم اور زیادتیاں ختم ہوں جو آخرکار سیاسی، معاشی اور اخلاقی مسائل کا اصل سبب قرار پاتی ہیں۔ یہ ایک عالمی مسئلہ ہے اور اسے صرف فلسطینی عوام کے آزادانہ حق خودارادیت کی بنیاد پر ہی حل کیاجا سکتا ہے۔ یہی صورت حال مقبوضہ کشمیر کی ہے خطے کا امن وسکون اس بات سے وابستہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں ریاستی دہشت گردی ختم ہو اور اہل کشمیر کو آزادانہ طور پر انتخابات کے ذریعہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے۔
گویا محض مذا کرات مسئلہ کا حل نہیں ہو سکتے مظلوم افراد کو حق خودارادیت دینے اور ان کی آزاد ریاست کے قیام کے بغیر مسئلے کا حل ممکن نہیں۔